سپہری کی شاعری میں کائناتی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر وفا یزدان منش

اسسٹنٹ پروفیسر اردو، تہران یونیورسٹی، ایران

سمیرا گیلانی

اردو سکالر، تہران یونیورسٹی، ایران

AN ANALYTICAL STUDY OF UNIVERSAL ELEMTS IN SEPEHRI'S VERSE

Wafa Yazdan Manish, PhD
Assistant Professor of Urdu
University of Tehran, Iran

Sameera Gilani
Urdu Scholar
University of Tehran, Iran

Abstract

Sohrab Sepehri is ranked amongst the Iranian poets of modern era who perceive Universe to be of central importance and consider it the epicenter of their inner self and emotional expression. Sometimes they find common moods with the Universe and sometimes they picture in it their happiness and sadness and express it with symbolism. Sepehri's message is grounded on all the elements of Universe. His poems are rich in Universal connotation, symmetry of life, caring for Universe and preventing it from menace, expressing empathy etc. Sepehri has an anagogic vision of the Universe.

Keywords:
کائنات، فطرت، سپہری، تہران، ایران، جدید فارسی شاعری، امیر قاسم خانی، عراقی، آشوری

سہراب سپہری 1928 میں قم میں پیدا ہوئے ۔انھوں نے اپنا بچپن کاشان کے اس باغ میں گزارا جوان کے اجداد سے منسوب تھا اور بعد میں یہی باغ سہراب کی شاعری پر بہت اثر انداز ہوا۔سہراب کے والد، اسداللہ سپہری ڈاک خانے کے ایک کلرک تھے اور ادب اور فن سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ سپہری نے اپنی خاندانی روایت کے مطابق فنون سیکھنے شروع کیے اور زندگی کے ابتدائی سالوں میں، فن کے مختلف پہلوؤں سے آشنائی حاصل کی۔ سہراب کی والدہ بھی ادب وہنر کی دلدادہ تھیں ۔انھوں نے اپنے خاوند کی وفات کے بعد سپہری کی تعلیمی سرپرستی کی ۔سہراب کی دادی حمیدہ سپہری کی کچھ نظمیں" زنان سخنور ایران" میں موجود ہیں۔ سہراب کے دادا ملک المورخین قاجاریہ حکومت کے مورخ تھے اور انھوں نے مشہور تالیف ناسخ التواریخ کوکئی جلدوں میں تحریر کیا ہے۔

سپہری نے 1943 میں میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا۔سہراب دوسال تک محکمہ تعلیم میں کلرک کی حیثیت سے مصروف رہے۔ یہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ اور محمد رضا شاہ کی حکومت کے آغاز کا تھا۔ ایک طرف سے سیاسی ناراضی اور دوسری طرف جوانوں کی مغربی ثقافت سے آشنائی ملک میں کئی نئی مشکلات کو وجود میں لائی، لیکن سہراب کو سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ محکمہ تعلیم میں سہراب کی عباس کی منش (مشفق کاشانی) سے گہری دوستی ہوئی اور ان کی حوصلہ افزائی کے سبب سہراب نے کاشان میں انجمن ادبی "انجمن صبا" میں شمولیت اختیار کی۔ منوچہر شیبانی کے مشورے پر سہراب نے تہران یونیورسٹی فائن آرٹ شعبے میں داخلہ لیا اور مصوری کے میدان میں تعلیم کو جاری رکھا۔ یہ ایران میں نئی شاعری اور مصوری کی شروعات کا دور تھا۔ 19 برس کی عمر میں سہراب نے اپنا پہلا شعری مجموعہ آرامگاہ (عشق یا در کنار چمن) کاشان میں چھپوایا، اور مشفق نے اس مجموعہ پر ایک دیباچہ لکھا۔ یہ مجموعہ کلاسیکی ادب کی ہیئتوں پر ایرج میرزا کی شاعری سے متاثر ہوکر لکھا تھا۔ 1948 میں سہراب کی پہلی آزاد نظم در قیر شب، ماہنامہ جہان نو تہران میں چھپی ۔ سپہری 1943 میں فائن آرٹ ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ ہوئے ۔اس زمانہ میں مصوروں کی تعداد میں کمی کی وجہ سے لوگ سہراب کو ایک شاعر کی بنسبت زیادہ تر ایک مصور کے نام سے جانتے تھے۔سہراب نے ہمیشہ کے لیے سرکاری ملازمت کو ترک کر دیا اور صرف آرٹ میں مصروف ہوگئے اور یہ سہراب کی عارفانہ زندگی کا آغاز تھا۔ 1965 میں سہراب نے اپنی طویل نظم ''صدای پای آب'' کو 'فصلنامہ آرش'' تہران میں چھپوایا اور اس نظم کے بعد وہ ایک شاعر کی حیثیت سے عام لوگوں کے درمیان پہچانے جانے لگے۔ان کے معاصر ادیب وشاعر اسے ایک شریف، بھولی بھالی اور پراثر شخصیت کا مالک جانتے تھے۔ سپہری آسمانی کتابوں قرآن، بائبل اور مذہب بودھ ازم سے متاثر تھے۔ ان کا طرز تفکر عرفانی تھا۔ اسی بنا پر بعض لوگ ان کے عرفان کو بودھ ازم

اور بعض اسلام سے متاثر سمجھتے ہیں۔ رضا براہنی ان کو "بچہ بودای کوچک" یعنی بودھا کا چھوٹا بچہ کہتے ہیں۔ (براہنی 289) اگر چہ بعض ان کو عارف نہیں سمجھتے ہیں ''سپہری اپنی صوفیانہ شاعری میں، مذہب اور عرفان نہیں سکھاتے ہیں بلکہ وہ ایک شاعر ہیں اور صرف شاعری کرتے ہیں''۔ (وستغیب 21 :1371) لیکن ان کی شاعری کے لب ولہجہ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ان کے عرفان میں اسلام اور بودھ ازم کا امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ سپہری وحدت الوجودی نظریے کے قائل تھے کہ سب ادیان بنیادی طور پر مشترک اور ایک جیسے ہیں اور صرف فروعات میں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ سپہری کے تمام افکار عارفانہ تھے" ان کے اپنے مخصوص تفکرات ہیں جن کی عقل و منطق اور زبان سے وضاحت نہیں کی جاسکتی''۔ (زرقانی 466) سہراب اپنے معاصر شعرا کی بنسبت نیما یوشیج کی طرز شاعری کو زیادہ سراہتے تھے۔ نیما کی تقلید کے باوجود ان کی شاعری کا اپنا ہی ایک ڈھنگ تھا اور وہ ماہرانہ لہجہ اور لفظ کو بروئے کار لاتے تھے۔ سہراب تہران یونیورسیٹی میں قدم رکھنے کے بعد نیما سے ملنے جاتے تھے اور یہی آشنائی، شعر نو کے شاعری کا آغاز بنی۔ (لنگرودی، ج 1، 539) سپہری فارسی کی کلاسیکی شاعری کا مطالعہ کرتے رہے اور شروع میں نیما کے عوامی لہجے میں شاعری کر کے قافیہ بندی پر زیادہ توجہ دیتے تھے اور اسی طرح ان کے اس دور کی شاعری میں مولانا روم کی شاعری کا انداز آشکار ہے۔ سپہری کی مصوری میں 'تاثریت' اور جاپانی فن ''ذن''(۱) کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ذن بودھ ازم کے محور ''فن برائے فن'' کے قائل تھے اور اسی طرح کہ ذن کا اصلی اور آخری مقصد، زندگی کی حقیقت اور دوسروں کو ''اشراق''(۲) کی طرف ہدایت کرنا ہے۔ سپہری کا یہی اشراق وادراک ہے جو کائنات کی طرف رجحان رکھتے ہوئے ہمیں سکھاتا ہے کہ صحیح طریقہ سے سننا اور دیکھنا چاہیے۔ سہراب کے شعری مجموعے: مرگ رنگ (رنگ کی موت) تہران 1951؛ زندگی خوابہا (سپنوں کی زندگی) تہران 1953؛ آوار آفتاب اور شرق اندوہ (سورج کا آوار اور دکھ کا مشرق) 1961؛ صدای پای آب (پانی کی آہٹ) 1965 اور مسافر تہران 1966؛ حجم سبز تہران (1967)؛ ماہیچ مانگاہ تہران (1976)۔ شعری مجموعوں کا کلیات ہشت کتاب 1976 کے عنوان سے شایع ہوا۔

سہراب کی بحیثیت شاعر شہرت صدای پای آب منظر عام پر آنے کے بعد شروع ہوئی۔ ان کی زندگی میں شادی کا لمحہ نہیں آیا۔ وہ فن کے شیدائی تھے اور فن کو حقیقی عشق سمجھتے تھے۔ (امیر قاسم خانی 1381، 172-171) سپہری 1979 میں بلڈ کینسر کا شکار ہوئے، علاج کے لیے لندن گئے لیکن علاج کروائے بغیر تہران واپس آ گئے۔ سہراب 21 اپریل 1980 میں تہران میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ انھیں گلستانہ (۳) میں دفن کیا جائے مگر انھیں مشہد اردہال، امام زادہ سلطان علی کے مزار کے نزدیک دفن کیا گیا۔ ان کے مزار پر انھی کی نظم کے دو اشعار رضا مافی سے کندہ کروائے گئے:

به سراغ من اگر می آیید/ نرم و آهسته بیاییدمبادا که ترك بردارد / چینی نازك تنهایی من (361) اگر مجھے میری تلاش میں آ رہے ہیں/ تو دھیےاورنرم قدموں سے آیئے تا کہیں ٹوٹ نہ پڑے/میری تنہائی کی نازک چینی۔

سپہری کی زندگی، پہلی دوہائیوں میں،علم وفن میں ہی گزری۔ ان کی زندگی کی تیسری دہائی،سفر کے تجربات اورمشاہدات میں بسر ہوئی جبکہ چوتھی دہائی مختلف ملکوں میں طولانی سفروں میں کٹ کی گئی۔سہراب نے مندرجہ ذیل مما لک میں سفر کیے اطالوی، جاپان، ہندوستان، بمبئی، بنارس، دہلی، آگرہ، کشمیر، لاہور (1961 / 1963)افغانستان، جرمن،فرانس،سپین ،اطالوی،امریکہ،مصر۔

سپہری کی شاعری میں کائنات کا تعارف

سپہری اپنے مختلف جذبات کا ملاپ اپنی شاعری میں ڈالتے ہیں ۔ وہ اپنے اندر ایک اندوہناک غم کو محسوس کرتے ہیں جس کو انھوں نے اشیا اور کائنات کے ادراک سے حاصل کیا ہے، کیونکہ وہ کائنات سے مل کر ان کے ساتھ ایک راستے پر چلتے ہیں

سپہری کا پیغام پوری کائنات کی صلح اور کائنات کے عناصر کے ادغام پر مبنی ہے۔ان کی نظمیں کائناتی عناصر سے بھرپور ہیں اور کائنات کے سبھی عناصر کو بروئے کار لاتے ہیں جن کو ہم بنیادی طور پر چند گروہ میں تقسیم کر سکتے ہیں: نباتات، جانور، سیارات وکہکشاں، اشیا اور جمادات اور دیگر قدرتی مناظر۔

کائنات کی تصویر کشی

سپہری کی شاعری میں قدرتی مناظر معبد کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس معبد میں سرخ پھول قبلہ ہے، صحرا سجادہ، روشنی محبت ہے اور ہوا موذن۔ وہ لوگ جو عام زندگی کے قیدی ہیں اور کائنات سے رابطہ نہیں رکھتے اس معبد تک نہیں پہنچ پاتے۔یہاں تک کہ وہ اپنی جان کو بھی کائنات کی ہر چیز سے جوڑ دیتے ہیں:

روح من درجهت تازه اشیاجاری است (سپہری، 287:1384) میری جان اشیا کے نئے پہلو کی طرف رواں ہے۔

وہ یاد دلا رہے ہیں کہ قدرتی مناظر ہمارے لیے بہترین سبق ہیں کیونکہ کائنات کی ہر چیز میں باہمی تعلقات ہیں اور ہم کیوں کائنات سے پیچھے رہ جائیں:

من ندیدم دوصنوبر راباهم دشمن /من ندیدم بیدی، سایه اش رابفروشدبه زمین/ رایگان می بخشد نارون شاخه خودرابه کلاغ (288) میں نے دو صنوبر کو ایک دوسرے کا دشمن نہیں دیکھا/ میں نے کسی بید کے درخت کو اپنا سایہ زمین پر بیچتے نہیں دیکھا/ نارون کا درخت اپنی شاخیں کوے کو بیٹھنے کے لیے مفت دیتا ہے۔

سپہری کے نزدیک وحدت الوجود کے مطابق نباتات صلح کی علامت ہیں۔ سپہری شروع میں کائنات کی طرف رخ کرتے ہیں اور پھر ان کے درمیان گھومتے ہیں آخر کار ایسا لگتا ہے کہ فطرت کے پوشیدہ بھیدوں کے پیغامبر کی طرح ہو گئے ہیں اور نہیں چاہتے کہ کائنات کی نظم و ترتیب میں کوئی چھوٹا سا رخنہ بھی پڑے۔

ونخواهیم مگس از سرانگشت طبیعت بپرد /ونخواهیم پلنگ از در خلقت بـرود بیـرون (294) اور ہم نہیں چاہیں گے کہ مکھی فطرت کی انگلی سے اڑے/اور ہم نہیں چاہیں گے کہ چیتا تخلیق کے دروازے سے باہر نکلے۔

سپہری کی نظموں میں ساری کائنات اللہ تعالی کی مصلحت اور حکمت کی بلکہ اللہ تعالی کے اذن سے وجود میں آئی ہیں" - صدای پای آب" میں کائنات سے ایک گہرا انعکاس محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاعر پورے طور پر کائنات کے ساتھ ہے اور اس کے ذریعہ اپنے معنوی عالم کو پاتا ہے یہاں تک کہ شاعر اپنی عبادت کو بھی فطرت سے تشبیہ دیتا ہے:

من مسلمانم /قبله ام گل سرخ / جانمازم چشمه، مهرم نور / دشت، سجاده من / من وضو با تپش پنجره ها می گیرم / درنمازم جریان دارد ماه، جریان دارد طیف / سنگ، ازپشت نمازم پیداست / همه ذرات نمازم متبلور شده اسـت (272) میں مسلمان ہوں / سرخ پھول میرا قبلہ / چشمہ میرا سجادہ، روشنی میری محبت / صحرا، میرا سجادہ / میں کھڑکیوں کی دھڑکنوں سے وضو کرتا ہوں / میری نماز میں چاند رواں ہے، روان ہے طیف / پتھر، میری نماز پڑھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ / میری نماز کے سارے پہلو ظاہر ہو گئے ہیں۔

یہاں کائنات کے ساتھ اعلی مقام بلکہ تقدس کا رشتہ دکھایا گیا ہے۔ گویا سپہری کائنات میں عشق حقیقی یا خالق کی جلوہ افگنی دیکھتے ہیں حتی کہ کائنات کو جمال خدا ہی جانتے ہیں اور وہ اپنی عبادت کی قدر وقیمت کو کائنات کے تقدس سے ہم کنار کرتے ہیں۔ کائنات کے علوم پر عبور سپہری کو ایک خاص اور متعین راستے پر چلاتا ہے۔ سپہری ایک عارف و شاعر کی حیثیت سے بودھ ازم کے زیر اثر کائنات میں ڈوبے ہوئے سلوک و ریاضت میں مصروف ہیں تا کہ وحدت الشہود تک پہنچ جائیں۔:

و خدایی که در این نزدیکی است / لای این شب بوها، پای آن کاج بلند (272) خدا تعالی کی خدائی جو یہاں نزدیک سے دیکھی جا سکتی ہے / رات کی اس خوشبوؤں میں، نیز اونچے صنوبر کے پاس۔

ایک اور عمدہ مثال "نیلوفر" کی نظم ہے جس میں شاعر، اپنے حقیقی عرفان کو کنول کا اشارہ کے طور پر تشبیہ دیتا ہے:

ازمرز خواب می گذشتم /سایه تاریک یک نیلوفر (118) خواب کی حد سے بڑھ رہا تھا/ ایک کنول کا تاریک سایہ۔

ہندوازم میں کنول جہان کا نمونہ اور زہدان تجلی الہی ہے۔ جب ایک نیلوفر مکمل طور پر کھل جائے تو ایک پہیہ کی طرح کہکشاں کا نمونہ بنتا ہے اور یہ فضا کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتا ہے۔ جب بودھا ایسے گہرے استغراق میں ہوتا ہے، بہت سے کنول ان کے پاؤں کے نیچے کھل جاتے، وہ ماحول کے چاروں طرف سے رواں ہوجاتے۔(بورکھارت، 118)

فانوس خیس (بھیگی لالٹین) نظم میں شاعر خود کو اوس جیسا سمجھتا ہے کہ تارے کی طرح دور رہنے کے باوجود چمکا دیتا ہے۔ گھاس پر چھڑکتا ہے اور مادی زندگی کو اپنے دل وجان سے پہچانتا ہے۔ یہاں سپہری کا تفکر روحانی ہے لیکن عالم مادیات سے جو قائل اوراک ہے اپنے اعلیٰ تفکر کی تصویر کشی کرتے ہیں ساتھ ہی اس دنیائے مادی میں روحانی کیفیت کو سامنے لاتے ہیں:

روی علف ها چکیده ام / . . . ./ نجوای نمناك علف ها را میشنوم (سپہری، 1384، 80) گھاس پر ٹپکا ہوں /___/ گھاس کی بھیگی ہوئی سرگوشیاں سن رہا ہوں۔

نجوای نمناك علف ها کا مطلب آنی وحدت ہے جو وہ فطرت کی آواز اور سرگوشی کو سنتا ہے۔

پھر شاعر "نجوای نمناک علف ہا" کے سینے میں ڈوب جاتا ہے اور وہ روشنی کا رس، ستارہ میں بدل جاتا ہے:

من ستاره چکیده ام /ازچشم ناپیدای خطا چکیده ام (80) میں ٹپکتا ہوا ستارہ ہوں/ خطا کی خفیہ آنکھوں سے ٹپکا ہوں۔

زندگی کا اپنا خاص تقاضا اور متعین وقت ہے اور سالک بیا ہر ماحول اور مکان کا موقع سمجھتا ہے۔

بقول مولانا رومی: الوقت سیف قاطع، (مولانا، ج1، 28)

سالک بیا اپنے موجودہ وقت کو نہ صرف فائدہ ونقصان اور برائی اور بھلائی کی بنا پر پرکھتے ہیں بلکہ اس کا وقت خاص انرجی کی کسوٹی میں ہے۔ سپہری اپنی مہارت سے وقت کو کائنات سے جوڑ دیتے ہیں:

میان لحظه وخاك، / ____/ ما به ابدیت گل ها پیوسته ایم (سپہری، 1384:167)

لمحہ اور مٹی کے درمیان، / ____/ہم پھول کی جاودانگی سے جڑے ہوئے ہیں۔

بظاہر پھول کی عمر بہت چھوٹی ہے اور یہ بات ابدیت کے مفہوم سے الٹی ثابت ہوتی ہے۔"جب تک سالک، وقت ومکان کی پابندی سے باہر نہ نکلے تو اس کی اڑان ازل سے وابستہ نہیں ہوتی، اور یہاں ایسا عالم جس میں کسی وقت کی پابندی نہیں ہے کو ازل کہتے ہیں جس میں ماضی اور مستقبل نہیں ہوتا۔(جامی 231)

پھر ہر چیز کے مختلف پہلو اور حواس، وحدت تک پہنچتے ہیں اور سالک ایسی دنیا میں ہے جس میں:

نہ ماضی ہے نہ مستقبل بل کہ صرف حال ہی موجود ہے اور حال (عراقی، 395) تہـــــــــی

بودونسیمی / . . . /من بودوتوبی /نمازی ومحرابی (سپہری، 1384، 212) خالی تھا اور صبح کی تازی ٹھنڈی ہوا /_____/ میں تھا اور تو / ایک نماز اور ایک محراب۔

کارلوس کاستانڈا کہتے ہیں "آپ کو معلوم ہے کہ ایک لحہ میں ابدیت ہو سکتی ہے؟ یہ ایک پہیلی نہیں حقیقت ہے صرف اس کی شرط یہ ہے کہ لحہ حال کو ادراک کر کے اس سے فائدہ اٹھایا جائے"(کاستانڈا، 15)

سپہری کے ہاں ہر چیز کے ساتھ فانی ہونے کا ربط دینا بے معنی ہے اور ہر شے کے ساتھ ایک لاوزال عنصر وابستہ ہے یعنی لامتنہی ابدیت ہے:

و دو کران خودرا ہرلحظه بیافرینیم، / برویم برویم وبیکرانی را زمزمه کنیم (سپہری، 1384، 174) اور اپنے دوسرے کو ہر لحہ خلق کریں / چلیں چلیں اور اک سرے کو گنگنائیں۔

وہ کائنات سے جوڑنے کو اتنا لازم سمجھتے ہیں کہ اگر اس ربط میں تھوڑا ہلکا پن پڑ جائے وہ بے چین ہو کر اپنے ربط کی جستجو کرتے ہیں۔چاہے پتھر ہو جس کی بظاہر کوئی حرکت نہیں ہوتی چاہے کوئی اڑنے والی چیز ہو:

ایـن سنگ، پیوندش بامن کو؟ آن زنبور، پروازش تامن کو؟ (226) اس پتھر کا جوڑ مجھ سے کہاں ہے؟ وہ بھڑ، اس کی اڑان مجھ تک کہاں ہے؟

یہاں ایسا لگتا ہے کہ شاعر تاؤ کے زیر اثر ہے۔تاؤ کے تناظر میں تخلیق کار فطرت سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ذہن کا مصور، فطرت سے ہمدردی کرتا ہے۔گرچہ بظاہر سپہری کے رجحانات تاؤ کے زیر اثر ہیں لیکن ان کی روح، عالمی عرفان وثقافت سے گہرا اثر رکھتی ہے۔وہ کنول کو جو یہاں کائنات کا بہترین نمونہ ہے اور پھول کی حیثیت کے علاوہ اس میں روحانی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں؛ تو وہاں اس کو مختلف مذاہب کے مقدسات سے ہمکنار کرتے ہیں۔

قرآن بالای سرم، بالش من انجیل، بستر من تورات، وزبور / پوشم اوستا، می بینم خواب/ بوداي در نیلوفر آب/ ہر کجا گلہای نیایش رست، منچیدم. دستـه گلی دارم (238)۔ قرآن میرے سرہانے پر بائبل میرا تکیہ تورات وزبور میرا بستر، اوستا

میرا کمبل، سپنا دیکھتا ہوں/ کنول پر ایک بودھا/ جہاں عبادت کے پھول اگے، میں نے توڑے۔اب میرا ایک گلدستہ ہے۔

شاعر، زندگی اور کائنات پر یکساں نظر ڈالتا ہے اس کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر جگہ اور کائنات کا ہر جز، انسان کی زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے اور یہ کائنات کو جغرافیائی یا قومی تقسیم کے قائل نہیں ہیں:

هر کجا بستم، باشم /آسمان، مال. من است/ پنجره، فکر، هوا، عشق، زمین مال. من است (291) میں ہر جگہ ہوں/ آکاش، میرا ہے/ کھڑکی، سوچ، ہوا، عشق، زمین میری ملکیت ہے۔

شاعر اپنے آپ کو فطرت کے ساتھ ہمکنار سمجھتا ہے۔صدای پای آب کے آخر میں، شاعر ہمیں کائنات میں موجود ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔اس نظم کا عنوان بھی قابل غور ہے۔سپہری نے نہ صرف پانی کی محاکات نگاری کی ہے بلکہ آہٹ کہہ کر اس میں نشانیاں وابستہ کی ہیں:

صبح ها نان و پنیرك بخوریم/وبکاریم، نهالی، سر هر پیچ کلام /وبپاشیم، میان دوبیجا تخم سکوت (293) صبح کے وقت روٹی اور پنیر سے ناشتہ کریں/ کلام کے ہر موڑ پر کوئی پودا اگائیں/اور دو بجوں کے درمیاں خاموشی کا بیج بو دیں۔

سپہری کائنات میں روحانی عالم کو پانے کے لیے، خود سے باہر آنے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ان کا اقرار ہے کہ عام سی زندگی میں یہ روحانی ارتقا پیدا نہیں ہوتا۔مشکلات برداشت کرتے وقت جب انسان اپنی کھوئی ہوئی توانائی کو کائنات سے حاصل کرتا ہے تب بھی وہ عروج تک پہنچ سکتا ہے۔جب وہ" بخار کے عالم" کو اس عروج کے لیے وابستہ کرتے ہیں یہ مراد لیتے ہیں کہ شوق کی شدت میں جب انسان اپنی ہوش کی حالت میں نہ ہو، تب ہی وہ کائنات کے پس پردہ نہاں خانوں تک رسائی پاتا ہے:

دیده ام گاهی درتب، ماه می آید پایین /میرسد، دست به سقف ملکوت/دیده ام سهره بهترمی خواند/ گاه زخمی که به پاداشته ام /زیروبم های. زمین را به من آموخته است .. (296) کبھی میں نے بخار کے عالم میں، چاند کو نیچے اترتے دیکھا ہے/ جو ملکوت کی چھت پر ہاتھ پہنچتا ہے/ دیکھا ہے سہرا بہتر گاتا ہے/ جو چوٹ مجھے لگی، اس نے مجھے زمین کی اونچ نیچ سکھائی ہے۔

شاعر کا مقصد عرفان تک پہنچنا ہے۔اس راستے میں کائنات ان کی مددگار ہیں۔سپہری کا عرفان فطرت پسند نوعیت اور کلاسیکی عرفان سے الگ ہے۔وہ معاشرتی اور سیاسی مسائل سے بہت دور بھاگتے ہوئے اپنی فطرت پسند نگاہ کی وجہ سے زندگی کو سیاست سے دور رکھتے ہیں:

زندگی رسم خوشایندی است/زندگی بال و پری دارد باوسعت مرگ/پرشی دارد اندازه عشق/زندگی چیزی نیست که لب طاقچه ی عادت ازیاد من وتوبرود/زندگی جذبه دستی است که می چیند (289)

یعنی زندگی ایک پسندیدہ رسم ہے/ زندگی کے موت کی وسعت جیسے پر ہیں/ اس کا عشق جیسے چھلانگ ہے/ زندگی ایسی چیز نہیں جو عادت کے طاق کے دھار مجھے اور تجھے بھول جائے/زندگی اسی ہاتھ کی طاقت ہے جو چن لیتی ہے۔

سپہری اور کلاسیکی عرفان میں تین وجوہات کی بنا پر اختلاف پائے جاتے ہیں،اول سپہری کا فطرت پسند عارفانہ تفکر، دوم عرفانی سلوک :وحدت الوجود تک پہنچنے کا طریق، سوم کائنات سے ہمکنار ہونے سے مقصد تک پہنچنا۔ (ناہفر 191) جب سپہری اپنے نظریات کو کائنات کے بارے میں بیان کرتے ہیں تو فطرت سے فائدہ اٹھاتے ہیں تا کہ ہر چیز کی حقیقی شکل کی وضاحت کر سکیں کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے:

چشم ہا را باید شست/جور دیگر باید دید ، (سپہری، 1384، 291) آنکھوں کو دھونا چاہیے/ایک اور انداز سے دیکھنا چاہیے۔

سپہری اپنے ذہن اور ضمیر کے باہر سے،فطرت اور کائنات کے اجزا پر توجہ دیتے ہیں اور ان کے متعین قانون کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور اس مجموعے کے ہر عنصر کو نہ صرف ضروری بلکہ خوبصورت سمجھتے ہیں ۔جب وہ کہتے ہیں کہ رات کی برائی نہ کریں،اصل میں ان کا اعتراض کلاسیکی شاعری پر ہے کہ عاشق کے ہاں رات میں ہجر کا دکھ بڑھ جاتا ہے اور یہ رات اس کے لیے نا قابل برداشت ہوتی ہے:

روشنیرا بچشیم/ . . . ./ونگوییم شب چیز بدی است/ونگوییم که شب تاب ندارد خبر از بینش باغ (293) روشنی کو محسوس کریں/۔۔/ اور نہ کہیں کہ رات ایک بری چیز ہے/اور نہ کہیں کہ رات باغ کی سوچ کی خبر لانے کی تاب نہیں لا سکتی۔

کائنات میں سیر اور مشاہدات

کائنات کا عشق اس بات کا باعث بنتا ہے کہ شاعر کا تعلق انسان اور جزوی عناصر سے کم ہونا جائے اور وہ کائنات سے مل کر تنہائی میں ابدیت کی طرف چلا جائے، اچانک "زن اثیری" (اساطیری معشوق) شاعر کے سامنے ہوتی ہے اور شاعر اپنی سب دھڑکنوں کو اسی کو نذرانہ دیتا ہے،اس وقت بھی شاعر کا جوڑ کائنات سے بے تعلق نہیں ہوتا:

پیکره اش خاموشی بود /لالایی اندوهی برماوزید /تراوش سیاه نگاهش

بازمزمه سبزعلف ہاآمیخت (155)اس کا سارا وجود خاموش تھا/غمناک لوری ہمیں سنائی گئی/ اس کی نگاہ کا سیاہ ٹپکنا سبز گھاس کی سرگوشیوں سے ملا ہوا تھا۔

شاعر وحدت الوجود تک پہنچنے کے راستے میں تنہا نہیں ۔"شاسوسا (۴) سپہری کی نظموں کی اثیری زن، وہی " دنا"ایرانی اساطیر میں سے اور عارفانہ دیوتا کا نمونہ ہے کہ ازل سے ابد تک سپہری کے پاس موجود ہے۔ (ہاتھفر،206)

شاسوسا، شبیه تاریک من / .. . ./! راه زندگی ام درتوخاموش می شود . . ./ / .ابدیت در شاخه ہاست (سپہری، 143:1384) شاسوسا،میری سیاہی کی طرح /---/میری زندگی کا راستہ تمھارے تک پہنچ کرخاموش ہوجا تا ہے/---/شاخوں میں ہمیشگی ہے۔

شب ہماہنگی (ہم آہنگی کی رات)نظم میں معشوق کی پوشیدہ دنیا نہ صرف شاعر کی دنیا کے لیے ضروری ہے بلکہ کائنات بھی اس سے تعلق رکھنے کے بغیر نامکمل ہے:

بی اشک، چشمان تو ناتمام است، و نمناکی جنگل / نارساست. . ./ به سوی ابدیت می رود (183) آنسو کے بغیر، تیری آنکھیں ادھوری ہیں،اور جنگل کی نمناکی/مبہم ہے/---ہمیشگی کی طرف چلتی ہے۔

اس کی موجودگی کے بغیر کائنات تھکی ہوئی اور بدحال ہے اور اس کی موجودگی پانی جیسی حرکت کا باعث ہے۔ بعض اوقات، کسی دکھی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے شاعر اپنی شاعری کے توازن کے لیے کائنات کو بروئے کار لاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب مزاحیہ انداز میں روایتی دنیا کے خاتمے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لگتا ہے کہ سپہری دنیا پر حاکم قانون کو کائنات کی ذات کے مطابق جانتے ہیں:

چرخ یک گاری در حسرت واماندن اسب /اسب درحسرت خوابیدن گاری چی /مرد گاری چی در حسرت مرگ (281) گاڑی کے پہیے کو گھوڑے کے رکنے پر خواہش/ گھوڑے کو گاڑی بان سونے پر خواہش/ گاڑی بان کو موت پر خواہش۔

سپہری اسی نظم میں توازن برقرار رکھنے کے لیے کائنات سے مدد لیتے ہیں تا کہ طنز کی کڑواہٹ میں مٹھاس ملا سکیں۔یہاں وہ کائنات کے تکامل پر خوبصورت انداز میں اشارہ کرتے ہیں:

سفر دانه به گل /سفر پیچک این خانه به آن خانه /سفر ماه به حوض/فوران گل حسرت از خاک/ریزش تاک جوان، از دیوار (282) بیج کا پھول بننے کا سفر/ گٹو اس گھر سے دوسرے گھر تک کا سفر/چاند کا تالاب کی طرف سفر/ مٹی سے حسرت کے پھول کا ابھرنا۔

شاعر کے خیالات اور آنکھوں میں کائنات ایسے رچ بس گئی ہے کہ وہ اپنی قیمتی چیزوں کو بھی کائنات سے جانچتے ہیں:

مادری دارم بهتر از برگ درخت (272) میری ایک ماں ہے جو نرمی اور نازکی میں درخت کے پتے سے بھی بڑھ کر ہے۔

اپنی ماں کو پتے سے تشبیہ دیتے ہیں اور حتی کہ اس سے بھی بہتر جانتے ہیں، درخت کا پتہ ہرا سبز ہے اور اسے سورج کی روشنی کی ضرورت ہے۔

شاعر کے پرخلوص دوست بھی پانی جیسے ہیں جو ہر لحہ میں ایک نئے پیغام کے حامل ہیں۔ سپہری نے رمزو کنایہ کے ذریعے نباتات اور درختوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک نظم میں، "اقاقیا" (پھول کا نام) کا نام لیتے ہیں۔ یہ درخت شاعر کی زندگی میں جاری ہے۔ سپہری نے اکثر اپنے شعری عناصر کو ماحول کے جانداروں سے لیا ہے کیونکہ وہ اپنے شعری عناصر کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے ہیں:

دهلیز ها انتظاری سرگردان بود / . . . /در ترسی شیرین تماشا میکرد (140) ان ڈیوڑھیوں میں ایک انتظار بھٹکا ہوا تھا/ ـــــ/ایک میٹھے ڈر میں دیکھتا جا رہا تھا۔

سالکان طریقت کی خواہش ہمیشہ حقیقی اشیا کا ادراک رہی ہے بلکہ وہ اس ادارک کو اپنا ہی فرض سمجھتے ہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ اے اللہ اشیا کی حقیقی صورت مجھے دکھا جیسی وہ ہیں۔ (سجری، 58)

ظاہر میں اشیا کی کوئی حرکت نہیں ہوتی لیکن اصل میں سب دیکھنے والوں کے ہاں ایسا رجحان نہیں ہوتا۔ ان میں سے بعض اپنے تصور کے مطابق اشیا میں زندگی کا سراغ لگاتے ہیں۔ سپہری بھی کائنات میں ڈوبے ہوئے مکاشفہ حاصل کرنے کے لیے دنیا کی رنگا رنگ ذات میں فنا ہوتے ہیں۔ اشیا کو بے واسطہ دیکھ کر شہودی ادراک پر مائل ہو کر ان کی ہجوم حقیقت (حقیقت کا ڈھیر) میں تعبیر کرتے ہیں:

سفر مرا به در باغ چندسالگی ام برد ۔(سپہری، 1384، 315) سفر مجھے میرے بچپن کے باغ تک لے گیا جب میں چند سال کا تھا۔

وایـن نسیم بوزیم وجاودان بوزیم / . . /ما وزش صخره ایم، ما صخره وزنده ایـم (174) اور صبح کی ٹھنڈی ہوا کی طرح چلیں اور سدا بہار چلیں/ـــــ/ ہم چٹان کی مانند قائم بذات رہیں مگر چلتے رہیں گے، ہم چٹان کی مانند ہیں اور زندہ ہیں۔

صخره، جمود اور صلابت کا نمونہ ہے۔صخره زنده، جور دیگر باید دید اور طرح دیکھنا چاہیے کے احساس کو ہمارے اندر ابھارتا ہے۔

کائنات سے رابطے کی نوعیت

سپہری اپنی شاعری کے آغاز میں کائنات سے جڑے ہوئے نظر نہیں آتے ہیں۔شروع میں کائنات کے عناصر، ان کی نظر میں اصل اورخوبصورت نہیں ہیں۔سپہری خودی کے آغاز میں طوفانی راتوں کو بھی یاد کرتے ہوئے اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں:

جہان آلوده ی خواب است /فرو بسته است وحشت در به روی هر تپش، هر بانگ۔ (سپہری، 1384، 67) جہان نیند سے بھرپور ہے/وحشت نے ہر دھڑکن پر اور بلند آواز پر اپنا دروازہ بند کیا ہے۔

شاعر نے ابھی کائنات اور اشیا کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے اور اپنے خیالات میں ایک قیدی کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہے،ان کا ذہن، حقیقت سے الگ اور دور ہے:

در کجا هستی نهان ای مرغ /زیر تور سبزه های تر یا درون شاخه های شوق؟/ هر کجا هستی بگو با من (70) اے مرغ تو کہاں چھپ گیا ہے/ بھیگے سبزوں کے جال کے نیچے یا شوق کی ٹہنیوں کے اندر؟/ جہاں بھی تو ہے مجھے بتا۔

لیکن یہی ان کی کائنات پر توجہ، ان کے عرفانی نظریہ (وحدت الوجود) کی نشاندہی کرتا ہے اگر چہ ابھی خفیہ طور پر محسوس ہوتا ہے:

سکوت بند گسسته است /کنار دره، درخت شکوه پیکر بیدی /در آسمان شفق رنگ/عبور ابر سپیدی (42-41) خاموشی کا بند ٹوٹ گیا ہے/ گھاٹی کے پاس، درخت بید کا شان دار تنا/رنگ شفق میں آکاش پر/سفید بادل کا گزرنا۔

یہاں شاعر نے جس چیز کو ایک لمحے کے لیے فطرت کے اندر دیکھا، بیان کر دیا ہے یعنی وہی "بودھ ازم کے تفکر" کی طرح شاعر کائنات کو پہچان دینے لگا ہے؛ جب سپہری کہتے ہیں" شکوہ پیکر بیدی"، صرف ان کا مطلب بید کی موجودگی کو بیان کرنا ہے؛یہ سپہری کے اصلی عرفانی نظریے کا آغاز ہے:

سفرهایی تو را در کوچه هایشان خواب می بینند(384) کئی سفر تیرا خواب اپنی گلیوں میں دیکھتے ہیں۔

بعد میں جب کہتے ہیں کہ وہ ''صدای پر بلدرچین'' (بٹیر کے پروں کی آواز) کو جانتے ہیں تو ان کو معلوم ہے کہ ریواس کجا میروید. . . باز کی میمیرد ریوند کہاں اگتا ہے---- باز کب مرتا ہے،زندگی خوابها کے مجموعے میں صرف اور صرف جو پرنده اور نبات موجود ہے مرغ افسانہ

اورنیلوفر کنول ہے۔اور شاعر حقیقی کنول نہیں ہے بلکہ مرغ افسانہ کے مقابلے میں افسانوی پودا ہے۔یعنی شاعراس مجموعہ میں ابھی فطرت اور کائنات کے عرفانی مفاہیم سے روشناس نہیں ہے۔صرف سب چیزوں کورنج سے بھرپور جانتے ہیں۔ سپہری کی شاعری میں فطرت سے ہٹنے کا احساس اپنی اصل سے دوری اوراپنی پہلی پیدائش کوبھول جانا ہے لامطلب ہے:

در بیداری لحظه ها / پیکرم کنار نر خروشان لغزید/ .../ پیکرم رادرریشه سیاهش بلعید (134-133) لمحات کی بیداری میں/ خروشان نہر کے کنارے پرمیرا جسم پھسل گیا/۔۔۔امیرے جسم کواپنی کالی جڑ میں نگل گیا۔

وہ اپنے آپ کواس صورت میں شاعر سمجھتے ہیں کہ یہ یقین ان کی شاعری میں برقرار رہے: نظم کا انکشاف، فطرت،کائنات، ماضی،خدااوران سب کاانکشاف خودی سے حاصل ہوتا جائے:

ماهی زنجیری آب است، و من زنجیری رنج(189) مچھلی پانی کی زنجیر میں دوچار ہے، اورمیں دکھ کی زنجیر میں۔

کائنات اورفطرت کی تعبیر سب کے ہاں ایک جیسی نہیں اسی لیے ادراک بھی ان کو یکساں حاصل نہیں ہے،فطرت اور کائنات کاانکشاف کرنا چاہیے۔ لیکن اس مجموعے میں،فطرت،ہمیں خود سے باہرنہیں نکال سکتی ہے۔

برسیم درختان زدم، آهنگ زخود روییدن وبه خودگستردن (257) میں نے درختوں کےتاروں کوچھیڑا،تال اپنے سےاگتا ہےاوراپنےاردگردپھیلتا ہے۔

شاعرکااس مجموعے میں کائنات سےایک عاشقانہ تعلق ہے۔ وہ انسان اور معاشرے سے دور ہوتے ہوئےایک عارفانہ کیفیت میں کائنات پرنظر ڈالتا ہے۔اس سے کائنات باتیں کرنے لگتی ہےاوروہ اس عارفانہ راستے میں اپنے آپ کواکیلامحسوس کرتا ہےاوراپنے سامنے کائنات میں بےتحاشا چھپے ہوئے راز کھلے پاتا ہے۔سپہری ان رازوں کومعلوم کرنے کےلیےکوشاں ہیں:

به آب روان نزدیک می شوم/ ناپیدایی در کرانه زمزمه می کند/رمزها چون انارترك خورده، نیمه شکفته اند / . ../دربی کران تو زنبوری پرمیزند (171-170) میں بہتے پانی کےقریب ہوتا جاتا ہوں/ ایک ناپید چیز کنارے میں گنگناتی ہے/ بھیدایک پھوٹےہوئے انارجیسے،ادھورے کھلے ہیں/۔۔۔/تیرے کھلے ماحول میں بھڑاڑتی ہے۔

ان اشعار میں شاعرکےکائنات سے لگاؤ کااندازہ ہوتا ہے۔ حیات کاراز" انارترک خوردہ" میں نمایاں ہے"۔حجم سبز" کےمجموعے میں شاعرکی کائنات میں موجودگی زیادہ سنجیدہ محسوس ہوتی ہے۔

شاعرفطرت سے ایسا روشناس ہوا ہے کہ پھلوں کی آوازیں سنتا اور جاوداں نیند کو ان کی چھلکوں پر محسوس کرتا ہے اور اپنی تنہائی کو کائنات سے سجاتا ہے:

بما سبد رفتم ب مي دان، صبح گاي بود /مي و ا آواز مي خواندن (369) میں ٹوکری لے کر منڈی کی طرف گیا، صبح کا وقت تھا/ پھل گا نا گا رہے تھے۔

آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو کائنات میں محو محسوس کرتے ہیں:

راه مي بينم درظلمت، من پرازفانوسم /من پرازنورم و شن، وپرازدارودرخت/ پرم ازراه، ازپل، ازرود، ازموج / پرم ازسايه برگي در آب :چه درونم تنهاست (337-336) اندھیرے میں مجھے راستہ نظر آ رہا ہے، میں لالٹین سے بھرا ہوا ہوں/ میں روشنی اور ریگ سے بھرا ہوں، اور درخت و پودوں سے بھرا ہوں/ راستے، پل، نہر، موج سے چھلانگ ماروں گا/ پانی پر پتے کے سائے سے چھلانگ ماروں گا: کتنا اندر سے خالی ہوں۔

سہراب کائنات کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں؛ ان کے ساتھ وقت گزارتے ہیں ان کو اپنی آغوش میں لیتے ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ "وہ سرتاسر کائنات ہیں۔ " ہر شخص کی دنیا، کردار اور اس کا تعلق کائنات سے کوئی نہ کوئی ربط پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ شاعر کائنات سے جڑا ہوا ہے تو ان کی عظمت کو محسوس کرتا ہے اسی لیے تنہائی کا احساس، شاعر کے دل میں اتر آتا ہے۔ سپہری کائنات میں تصوف سے بھی گہرا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں وہ ایسے کائنات میں ہی تبدیل ہو کر روحانیت سے بھرپور مستفید ہوتے ہیں اور یہی روحانیت دوسروں کی جان پر منتقل کرنے کا خواہشمند ہیں:

روزی/خواهم آمد، وپيامي خواهم آورد /درر گ ها، نور خواهم ريخت / وصداخواهم درداد/:اي سبدهاتان پرخواب. سيب /آوردم، سيب سرخ .خورشيد (339-338) ایک دن / آؤں گا، اور ساتھ پیغام لاؤں گا/ رگوں میں، روشنی ڈالوں گا/ اور پکاروں گا/: اے لوگو جو تیری ٹوکریاں سیب کی نیند سے بھری ہوئی ہیں / میں سورج کا سرخ سیب لایا ہوں۔

سپہری اپنی خواہشوں کا بیان کرتے ہیں جب فطرت اور کائنات خوشی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گی:

خواهم آمد سرِ هر ديواري، ميخكي خواهم كاشت/پاي. هر پنجره اي، شعري خواهم خواند /هر كلاغي را، كاجي خواهم داد . . . ./ آشتي خواهم داد/آشنا خواهم كرد/راه خواهم رفت/نور خواهم خورد/دوست خواهم داشت. (341-340) ہر دیوار پر چڑھ جاؤں گا، قرنفلی کا پھول اگاؤں گا/ ہر کھڑکی پر، نظم سناؤں گا/ ہر کوے کو، ایک کاج دوں گا/۔۔۔/ صلح کرواؤں گا/ ملواؤں گا/ راستوں پر چلوں گا/ روشنی کھاؤں گا/ محبت کروں گا۔

سہراب کنایہ، استعارہ اور مجاز کے ذریعے اشیا، کائنات اور واقعات کی تشریح کرتے ہیں۔ کیونکہ شاعر رومانویت کے زیر اثر ہے تو مہر و محبت سے کائنات پر نگاہ ڈالتا اور اس کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے کہ سپہری کائنات سے دو طرح سے رابطہ قائم رکھتے ہیں:

1)"حقیقی تعابیر سے اشیا اور کائنات کا مجازی بیان: شاعر مجاز اور استعارہ اور کنایہ سے کائنات اور اشیا کو کام میں لاتا ہے کیونکہ شاعر، ایک مصور بھی ہے جو نظم میں تصویر کشی کرتا اور ساتھ ساتھ تصویر بھی بناتا ہے۔2)اشیا اور کائنات سے گہرا تعلق: سپہری اشیا اور کائنات کو مہربان نگاہ سے دیکھتے ہیں۔سپہری کی رومانویت، فطرت پسندی سے ماخوذ ہے وہ کائنات اور فطرت کو رومانویت جیسے، کوئی عبور گاہ جانتے ہیں اور پھر عرفان اور وحدت الوجود تک پہنچتے ہیں؛ خاص طور پر " اوپنشد" اور ہندو فلسفے کی وحدت تک"۔(دستغیب، 9-8) سپہری انسان کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں اور اس کے ایک اہم پہلو یعنی کائنات سے وابستگی پر خاص توجہ دیتے ہیں۔وہ کائنات کے درمیان سے مفہوم نکالتے اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے کنایہ سے کام لیتے ہیں۔انسان کائنات کا ایک جز ہے اسی لیے وہ اشیا، اجسام، فطرت اور کائنات وغیرہ میں سے ہیں نہ ان کے علاوہ! "سپہری کی تخلیقات اصل میں فطرت اور کائنات پر مبنی ہیں۔ .فطرت پر نظر ڈالنا اور آدمیوں سے دور ہونا سپہری کا اصلی ڈھنگ ہے۔"(آشوری، 40) شروع میں شاعر کائنات کی سیر کرتا ہے لیکن ابھی ان کے "مکاشفات"(۵) شروع نہیں ہوتے ہیں اور ان کا رابطہ کائنات سے صرف ایک احساس کا تعلق ہے۔ابتدا میں ان کی شاعری میں فطرت و کائنات کی طرف توجہ، کلاسیکی ادب کے ڈھانچے میں نمایاں تھی لیکن رفتہ رفتہ علامتی و عرفانی شکل اختیار کرتی چلی گئی جس طرح وہ صدای پای آب اور حجم سبز میں دیکھائی دیتی۔شاعر سمندر کی گہرائی سے بے خبر ہے!ان کے ہاں دریائے معرفت پر شناخت کافی نہیں لگ رہی:

دست از دامان سحر برداشتم /تا بیاویزم به گیسوی سحر /خویش را از ساحل افکندم در آب / لیک از ژرفای دریا بی خبر، سپہری، 1384، 15 میں نے صبح کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا/ تا کہ صبح کی زلف سے لٹک سکوں/ اپنے آپ کو ساحل سے پانی میں گرایا/ لیکن پھر بھی سمندر کی گہرائی سے بے خبر ہی رہا۔

ابتدا میں شاعر کائنات کے عناصر سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن اس سے اب بھی ایک گہرا تعلق قائم نہیں کر سکا۔لگتا ہے سپہری ابھی تک کائنات کے بارے میں اتنا بھروسا نہیں کر سکتے ہیں:

همپای رقص نازك نی زار /مرداب می گشاید چشم ترسپید (18) سرکنڈے کے ناچ کے ساتھ /دلدل بھیگی سفید آنکھ کھولتا ہے۔

صرف کائنات کو جان بخشتے ہوئے اپنے حالات کا بیان کرتے ہیں۔بعد میں کائنات کے ایک جز میں بنتے ہوئے کہتے ہیں:

من صدای نفس باغچه رامیشنوم(286) میں باغیچے کی سانس لینے کی آواز سنتا ہوں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ مکان وزمان سے فارغ ہوکر ماورا کی کیفیت اختیار کرتے ہیں کہ زمین کا آغاز اور پانی کی تقدیر کو بھی سمجھنے لگتے ہیں اور یہاں شاعر کا فطرت سے رابطہ نقطۂ عروج تک پہنچتا ہے:

من به آغازز مین نزدیکم /نبض گلهارامیگیرم /آشناهستم باسرنوشت تر آب (287) میں زمین کے آغاز میں قریب ہوں/پھولوں کا نبض پکڑتا ہوں/ پانی کی نمناک تقدیر سے آشنا ہوں۔

یگانگی اس حد تک پہنچتی ہے کہ شاعر اپنے اقربا کو بھی فطرت کے عناصر کے ذریعے بیان کرتا ہے اس ضمن میں شاعر کائنات کا احترام کرتا ہے:

شاعری دیدم ہنگام خطاب، به گل سوسن میگفت:شما(278) میں نے ایک شاعر کو دیکھا خطاب کرتے ہوئے،سوسن کے پھول سے کہتا تھا: آپ۔

سپہری کی بودھ کی تعلیمات سے روشناسی ان کے بعض اشعار میں آشکار ہے۔" اگر آدمی اپنے وجود کو تمام کائنات کی طرح۔ ایک ہی صورت میں جانے تو ہر چیز کو اپنی جگہ میں رکھ کر اس سے پیار کرتا ہے اس حد تک کہ اپنے دل کی ہر دھڑکن کو، کائنات کی دھڑکن ہی جانتا ہے۔پھر وہ چیز جو جز سے متعلق تھی اب کُل میں جگہ پاتی ہے۔یہ عشق شور اور آگ کے ساتھ نہیں بلکہ پیار کے ساتھ ہوتا ہے"(ندوشن، 147)۔

کوه، نزدیک من است :۔/وبیابان پیداست /سنگ ها پیدانیست، گلچه ها پیدانیست/ سایه های یاز دور /مثلتن هایی آب، مثل آواز خدا پیداست

سپہری، 1384 ، 353 پہاڑ،میرے قریب ہے:۔۔۔/اور صحرا نظر آتا/ پتھر نظر نہیں آتے، چھوٹے پھول نظر نہیں آتے /دور سے سائے/ پانی کی تنہائی کی طرح،خدا کی آواز جیسے نظر آتے۔

کائنات اور شاعر،دنیا کے آغاز کا مظہر ہوکر وحدت الوجود کا ثبوت دیتے ہیں۔دوسری نظموں میں شاعر کائنات کو عارف جانتا ہے جن کا عرفان بے چینی کی شکل میں آشکار ہوتا ہے:

میوه ها درآفتاب، آوازمی خواندند/درطبق ها، زندگی روی کمال پوست ها/خواب سطوح جاودان می دید / اضطراب باغها درسایه هرمیوه روشن بود /نگاه مجهولی میان تابشها شنا میکرد(370) پھل،دھوپ میں،گا

رہے تھے / خوانوں پر، زندگی جلدوں کے کمال پر/ جاودان کی سطحوں کا سپنا دیکھتی تھی / باغوں کی بے چینی ہر پھل کے سائے میں اجلی ہوئی تھی / ایک مبہم نگاہ لشکاروں کے درمیان تیرتی تھی ۔

شاعر کائنات کے سب اجزا کی آواز اور ان کی حالت کو سنتا اور دیکھتا ہے ۔

کائنات ومعاشرہ

آخری مجموعے میں شاعر ایک عارف کے مقام میں ملکوت تک پہنچتا ہے ۔کبھی کبھار سپہری دور تک جا کر اپنی سیر میں آدمی اور اس کے تفکر کو بھی نظر انداز کرتے ہیں کیونکہ وہ صرف اپنے دل کے ذریعے عروج پر سوچتے ہیں:

روزی که/ دانش لب آب زندگی می کرد /انسان /.../ درسمت پرنده فکر می کرد (424-423) اس دن جب/ دانش پانی کے کنارے پر بسر کرتی تھی نشان/ انسان/ ---/ پرندے کے بارے میں سوچتا تھا ۔

سپہری ایک معیاری صورتحال کی تصویر کشی کرتے ہیں، دانش کی اسی وقت قدر رہے جب وہ جاری ہو، اسی وجہ سے سپہری اس کو رواں پانی سے ہمکنار کرتے ہیں اور انسان کو کامیابی اس وقت مل سکتی ہے جب وہ دنیوی زندگی سے دست بردار ہو کر بلندیوں سے متعلق سوچے۔۔۔ سپہری اپنی یہ معیاری حالت کو گزشتہ زمانہ کی ڈھال کے طور پر پیش کرتے ہیں بظاہر یہ وقت ماضی کا ہے جب دلوں میں دانش اور حقیقت اکٹھے تھے :

زانوی عروج /خاکی می شد /آن وقت/انگشت تکامل / در ہندسه دقیق اندوه / تنها می ماند (425) عروج کا گھٹنا / مٹی میں ملوث ہوتا تھا/ اس وقت / تکمیل کی انگلی / دکھ کے سنجیدے ہندسے میں / اکیلی رہتی تھی ۔

پھر شاعر ماضی سے گزر کر کے حال تک آتا ہے :

حنجره جوی آب را /قوطی کنسر و خالی زخمی می کرد (416) پانی کی نہر کے گلے کو / خالی ڈبا چوٹ لگاتا تھا ۔

شاعر جن سیاسی اور معاشرتی حالات میں رہتا ہے ان کی تصویر اپنی شاعری میں کھینچتا ہے۔

شاعر ماضی کے بارے میں سوچتا ہوا آہ بھرتا ہے اور اس کی حسرت میں کہتا ہے :

پیش از این در لب سیب / دست من شعله ور می شد / پیش از این یعنی / روزگاری که انسان از اقوام یک شاخه بود (431) اس سے پہلے سیب کے ہونٹ پر / میرے ہاتھ میں آگ کی لپٹ ہوتی تھی / اس سے پہلے یعنی / جب لوگ ایک ہی ٹہنی سے تھے ۔

اس کی حسرت کی وجہ یہ ہے:

بعددیدم از موسم دست ہایم /ذات ہرشاخہ پرہیز می کرد (436)اس کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں کے موسم سے /ہر ٹہنی کی فطرت پرہیز کرتی تھی۔

اوراس مجموعے کی انتہا تک یہی سیر جاری رہتی ہے یعنی: شاعر کی حسرت اوران کی ناراضی اپنے معاشرے سے:

دروقت پیش ازطلوع ہجاہا/محشری ازہمہ زندگان بود(436)ہجوں کے نکلنے سے پہلے /سب زندہ مخلوقات کی ایک بھیڑ تھا۔

وہ سلوک کے راستے میں دکھ سے بھرپور ہیں کیونکہ وہ چیز جس کو حقیقت سمجھتے ہیں اپنے ماحول میں ڈھونڈتے ہیں لیکن اس میں نہیں پاتے:

اززمین ہای تاریک / بوی تشکیل ادراك می آمد(451)اندھیری زمینوں سے/ ادراک کے وجود میں آنے کی خوشبو آرہی تھی۔

کائنات سے ہمکنار

زندگی عشق سے جنم لیتی ہے اوریہ سپہری کی عاشقانہ نظر، کائنات پر ان کی عارفانہ نگاہ کا سرچشمہ ہے۔عشق، سپہری کی نظموں میں ذاتی اورمجازی عشق نہیں بلکہ ہستی اور کائنات کا عشق ہے۔ سپہری کی نگاہ میں عشق، آدمی کو" گرمی یک سیب "جیسابدل دیتا ہے:

وعشق، تنہا عشق /ترابہ گرمی یک سیب میکند مانوس (306)اورعشق،صرف عشق / تجھے ایک سیب کی گرمی سے مانوس کردیتا ہے۔

سپہری عاشق کوکل کائنات میں شامل کرتے ہیں جس میں عشق تنہائی سے ہمکنار ہے۔عاشق ایک چھوٹی مچھلی کی طرح ہے کہ کائنات کے سمندر کا عاشق ہے لیکن اس کو چھو بھی نہیں سکتا اسی لیے حزن اور تنہائی، اس کی ساتھی ہے:

خیال می کنم / دچار آن رگ پنہان رنگ ہا ہستی (307) سمجھتا ہوں/ رنگوں کی پوشیدہ رگوں سے دوچار ہے۔

سپہری،خدا کی شناخت اوراس کے قریب ہونے کے لئے جس راستے کو ڈھونڈتے ہیں وہ کائنات ہی سے گزرتا ہے:

وخدایی کہ دراین نزدیکی است/لای ایں شب بوہا، پای آن کاج بلند /روی

آگاہی آب، روی قانون گیاہ (272)وہ خدا جو آس پاس ہے/ شب بوؤں کے بیچ میں، اونچے صنوبر کے نیچے/پانی کی آگہی پر، پودے کے قانون پر۔

سپہری فطرت پرست ہیں اوران کی نگاہ کائنات کے متعلق بہت سادہ ہے۔ وہ ہمیشہ آرام وسکون کے طلب گار ہیں اور کائنات کو حقیقی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ان کے انداز بیان سے ایسا لگتا ہے کہ کائنات ان کی شیدائی ہے:

"شعرا کا عقیدہ یہ ہے کہ جب فطرت کی سیر کرنے جاتے ہیں تو زمین وآسمان اپنے بھیدوں کو ان سے بیان کرتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ وہ کائنات کا عاشق ہے۔زمین اور آسمان کے درمیان بہت سی چیزیں موجود ہیں کہ جو صرف شعرا ان کو نیند میں دیکھ سکتے ہیں" (نجہ، 171)

نطشے نے یہ باتیں طنزیہ انداز میں لکھی ہیں لیکن یہ وہی واقعہ ہے جس سے سپہری دوچار ہوتے ہیں اوراس راستے میں عرفان ان کے ساتھ ہے۔نظم ''مسافر''میں، جب مسافر اپنے سفر کی انتہا پر پہنچ کر کرسی پر بیٹھتا ہے تو کائنات اس کو بلاتی ہیں:

دلمگرفته /دلم عجیب گرفته است/ تمام راه به یک چیز فکر میکردم / ورنگ دامنه ها، هوش ازسرم میبرد (305) میرا دل بھرا ہوا ہے/میرا دل بہت بھرا ہوا ہے/ سارے راستے میں ایک ہی چیز کے متعلق سوچتا رہا ہوں اور پہاڑوں کا رنگ، میرا ہوش اڑاتا ہے۔

لیکن کائنات کی عظمت اور وسعت، مسافر کے دل میں حقارت کا احساس ابھارتی ہے اسی وجہ سے ابھی کائنات کے بھید کو نہیں سمجھ سکتا دکھی رہتا ہے۔

وغم اشار محوی به رد وحدت اشیاست / خوشا به حال گیاهان که عاشق نورند/ . . ./نه وصل ممکن نیست / همیشه فاصله ای هست (308) اورغم اشیا کی وحدت کی تردید پر ہلکا اشارہ ہے/ کتنے پودے خوش قسمت ہیں کہ وہ روشنی سے دلدادہ ہیں/۔۔/وصال ممکن نہیں ہے/ہمیشہ تھوڑا فاصلہ رہتا ہے۔

سپہری کنایہ کے طور پر اپنے کائنات سے تعلق کو دوسری زبان میں بھی بیان کرتے ہیں کہ یہی غم ان کو وصال سے دور کرتا ہے۔وہ کائنات میں ایک باہمی ربط دیکھتے ہیں اوران کے لیے وحدت الوجود کے قائل ہیں:

چه فکرِ نازك. غمناکی /!!وغم، تبسم. پوشیده نگاه گیاه است /وغم اشاره ی محوی به رد وحدت. اشیا است (307) کتنی غمگین نازک سوچ ہے/!!اورغم، پودے کی خفیہ نگاہ

کی مسکراہٹ ہے/اورغم اشیا کی وحدت کی تردید پر ہلکا اشارہ ہے۔

نظم "مسافر" کے آخر میں شاعر عبور کے لفظ کو بروئے کار لاتا ہے یعنی وہ رکنا جائز نہیں سمجھتا ہے اور حرکت کو تکامل کے لیے لازمی جانتا ہے:

عبور باید کرد/صدای باد میآید، عبور باید کرد/ومن مسافرم، ای بادهای همواره (327) ضرورگزرنا چاہیے/طوفان کی آواز آرہی ہے،ضرورگزرنا چاہیے/اورمیں ایک مسافر ہوں،اے ہمیشگی کے طوفان۔

عبور یعنی کائنات میں سیر کرنا، کائنات کے وہ پہلو جس کو کسی نہ کسی نے دیکھا ہوگا۔خلوت ابعاد زندگی (زندگی کے خلوت پہلو)، دریچہ ہای شعور (شعور کی جھروکے)وغیرہ انھی پہلوؤں میں سے ہیں۔

و در تنفس تنهایی/ دریچه های شعور مرا به هم بزنید/روان کنیدم دنبال بادبادك آن روز/مرابه خلوت ابعادزندگی ببرید/حضورهیچ. ملایم رابه من نشان بدهید (328) اورتنہائی کی سانس میں/ میرے شعور کی جھروکوں کو ہلائیں/ مجھے اس دن کے پتنگے کے پیچھے چلادیں/مجھے زندگی کے تنہا پہلوؤں کے پاس لے جائیں/ مجھے نرمی کی غیر موجودگی کو دکھادیں۔

اوراسی طرح اپنے احساس کا ایک پکار سے اظہار کرتا ہے:

به سراغ من اگر مي آييد،/ پشت يچستانم/ آدم اين جا تناست(360-361)

اگر مجھے تلاش کرنے آتے ہو،/تو میں لامکان وجود کے پیچھے ہوں/انسان یہاں اکیلا ہے۔

شاعر کی ہیچستان خوبصورتی کا مالک ہے جہاں وہ سب شقائق (خشخاش کا پھول) کی معراج تک پہنچ گیا ہے اور سب سادہ چیزیں،انسان کی ذاتی چیزیں ہیں اور آدمی ابدی اور سبز تنہائی کو تجربہ کرتا ہے:

به سراغ من اگر مي آييد،/ نرم و آست بي ايييد، مبادا كه ترك بردارد /اچي ني نازك تنايي من (361)اگر مجھے تلاش کرنے آتے ہو ،/تو نرمی اور دھیرے سے آئیں،کہیں ٹل نہ پڑے/میری تنہائی کی باریک چینی۔

یہاں قاری یہ سمجھے گا کہ شاعر موت کے دوسرے رخ کی بات کرتا ہے یعنی وہ موت جو زندگی کی طرح خوبصورت اور سادہ پن کی لطافت سے بھرپور ہے۔شاعر فطرت کے بارے میں کبھی ایسا نظریہ نہیں رکھتا جیسے سردی میں سب چیزیں فسردہ اور ہلکی دکھائی دیتی ہیں؛اسی لیے سپہری کا ڈھنگ بدلتا نظر آتا ہے اور یہ ان کی بظاہر منفی نگاہ اور بے روح ترکیب جنبش واژہ زیست (جیون کے لفظ کا ہلنا) کی آمیختگی سے کسی حد تک متعادل رویہ اختیار کرتے ہیں:

پشت کاجستان، برف /برف، یک دسته کلاغ/جاده یعنی غربت /باد، آواز،

مسافر وکمی میل به خواب/ شاخ پیچک و رسیدن وحیاط (386) صنوبر کے درختوں کے پیچھے، برفباری/ ابرفباری، کوے کا ایک غول/ راستہ یعنی پردیسی/ ہوا، آواز، مسافر اور نیند کی طرف تھوڑا سا میلان/ گٹو کی ٹہنی و پہنچنا اور آنگن ۔

شاعر اس قدر کائنات سے پیار کرتے ہیں کہ حتی دعا کے موقع پر اپنے احباب کے لیے ایسی دعا دیتے ہیں:

پرتقالی پوست می کنم /شہر در آیینه پیدا بود /دوستان من کجاہستند / روزہاشان پرتقالی باد (381) مالٹا چھیل رہا تھا/ آئینے میں شہر نظر آ رہا تھا/ میرے دوست کہاں ہیں/ ان کے دن مالٹے جیسے ہوں ۔

سپہری، فطرت اور مافوق الفطرت میں غوطہ ور ہیں۔ یہ فطری بات ہے کہ وہ خود کو اس دنیا میں ایک مسافر سمجھتے ہیں؛ مگر جب سرود زندہ دریا نوردان کہن (پرانے جہاز رانوں کا زندہ گانے) کو بہ گوش روزنہ ہای فصول میخواند (موسموں کے جھروکوں کے کانوں پر سناتا ہے) تو اس وقت یہ بات فطرت سے بڑھ کر مقام پاتی ہے کیونکہ "دریا نوردان کہن" یعنی وہ ایسا دریا نورد ہے جو ماضی میں مرگیا ہے؛ دوسری طرف شاعر کہتا ہے "سرود زندہ" جس میں ایہام ہے: وہ نغمہ جواب تک سنا جا رہا ہے اور کسی جاندار کی طرح زندہ ہے، یا وہ نغمہ جو اپنے نئے اور من پسند مفاہیم کی وجہ سے اب تک جاری وساری ہے، دوسری عبارت میں نہ ان کے مفاہیم زندہ ہیں اور نہ خود نغمہ۔ دوسری بات جو عام سے ہٹ کر معنی رکھتی ہے وہ گوش روزنہ ہای فصول ہے یعنی فصول موسموں کا کوئی روزنہ ہے جس کا کان بھی ہے اور شاعر اس میں گیت گاتا رہتا ہے:

و من مسافر قایق/ ہزار ہاسال است / سرود زنده دریانوردان کہن را / به گوش روزنه ہای فصول می خوانم و پیش می رانم (310) اور میں کشتی کا مسافر/ ہزاروں سالوں سے/ پرانے جہاز رانوں کے زندہ گانے کو/ موسموں کے جھروکوں کے کان پر سناتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں ۔

یہاں زندگی کا مسئلہ گویا ایک سمندر کی طرح ہے جس میں شاعر ایک مسافر کی طرح سیر کرتا ہے۔

سپہری، کائنات کی خوبیاں علامت کے مطابق تصور کرتے ہیں۔ اندرہ لالاند علامت کے مطلب کو ایسے واضح کرتے ہیں: ''ہر محسوس ہونے والی نشانی جو کوئی نارمل رابطے سے ایک ناپیدیا نامحسوس چیز کو دیکھنے کے قابل بنائے ۔(سید حسینی، 538) علامت نگار کا کائنات کے بارے میں عقیدہ اپنی معنوی زندگی پر مبنی ہے ہم خود ہیں جو محسوس کرتے ہیں، ہمارے احساس، اشیا اور کائنات میں منعکس ہوتے ہیں ۔سب کائنات انسان کی زندگی اور وجود کی علامت ہیں۔ سپہری بھی ان کو نئے روپ، نئی اشیا اور نئے مفاہیم تخلیق کرتے ہیں:

"روح من در جهت تازه اشیا جاری است /روح من کم سال است "سپہری، 288،1384 میری روح اشیا کے نئے پہلو میں رواں ہے /میری روح کی عمر کم ہے۔

کائنات وخلقت

سپہری اپنی شاعری میں خدا کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں ۔" وہ ہمیشہ خدا کو اپنی ذات اور کائنات میں حاضر اور ناظر سمجھتے ہیں اور فطرت کی سب تبدیلیوں میں خدا کو اصلی محرک سمجھتے ہیں یعنی سب کائنات کے درمیان کوئی وحدت موجود ہوگی جس کا باعث اللہ تعالی کا وجود ہے ۔دوسرے الفاظ میں وحدت کثرت کے اندر پوشیدہ ہے ۔(نوری، 229) سپہری صرف اپنے ابتدائی شعری مجموعوں میں فطرت پسند تھے یعنی اشیا اور کائنات کے بیرونی وجود کو دیکھتے تھے لیکن بعد میں وہ سرلسٹ ہوگئے۔ شاعر نئے علوم پر تنقید کرتا ہے؛ وہ علم ودانش جو آدمی کو کائنات اور ان کی پہچان سے دور کرتا ہے اسی لیے وہ آدمی ہستی سے تعلق نہیں رکھ سکتا:

باغ ما شاید، قوسی از دایره سبز سعادت بود /میوه کال خدارا آن روز، می جویدم در خواب / آب، بی فلسفه می خوردم توت بی دانش می چیدم. سپہری، 275،1384 ہمارا باغ شاید، سعادت کے دائرے کا ایک قوس تھا/اس دن میں خدا کا کچا پھل، نیند میں چباتا تھا/پانی، بے غیر فلسفے کا پیتا تھا، بے علمی کا توت توڑتا تھا۔

"میوہ کال خدا" کا مطلب یہ ہے :اللہ تعالی کی پہچان کے بغیر اس کو محسوس کرنا، " آب بی فلسفہ خوردن" یعنی :پانی کی طبعی اور کیمیائی ماہیت کو جانے بغیر پینا، " انار ترک خوردہ "یعنی وہ انار ہے جو مکمل طور پر پکا ہوا ہو اور خود پک کر گر جاتا ہے:

وخدایی که درایین نزدیکی است / . . ./روی آگاهی آب، روی قانون گیاه (272) وہ خدا جو یہاں قریب ہی ہے /۔۔۔۔/پانی کے شعور پر، نباتات کے قانون پر۔

شاعر کا خدا ''آگاہی آب'' میں ہے۔ پانی، روشنی کا نمونہ ہے۔ نباتات بھی تکامل کا نمونہ ہیں"۔ قانون گیاہ" وہی پانی سے فائدہ اٹھانا ہے یعنی زندگی کے چرخے کا آغاز۔ شاعر کا خدا اسی کے آس پاس ہے اور اس کی زندگی کے نباتات اللہ سے پیار میں بھرپور ہیں ۔پانی بھی اللہ سے سرشار ہے۔ سپہری کے یہ مشاہدات، حیات کے سچے مظاہر سے بالکل الگ ہیں ۔اللہ کا عشق، ابہام کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔اب شاعر، کائنات سے یگانگی تک پہنچتا ہے:

میدانم، سبزه ای رابکنم خواهم مرد /میروم بالا تا اوج، من پرازبال و پرم (336) جانتا ہوں، اگر ایک سبزے کو توڑ دوں تو مر جاؤں گا/اوپر تک جاؤں گا عروج تک، میں پروں سے بھرپور ہوں۔

"صـدای پـای آب" میں شاعر نے پرانے دور سے لے کر اپنے دور تک ایک تاریخی چکر لگایا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسان کی زندگی ایک تاریخی تسلسل ہے اور یہ تاریخ اس کے وطن تک محدود نہیں ۔ان کے ہاں دنیا کی کائنات میں یونگی ہے :

اهـل کاشانم / نسبـم شـایدبرسد/بـه گیـاهـی در هـنـد، به سفالینه ای از خاك سیـلـک (274) کاشان سے ہوں/میرا نسب شائد پہنچ جائے/ہند میں ایک نباتات سے،سیلک کی مٹی سے بنا ہوا برتن۔

اس کے بعد شاعر، اپنے بچپن کا سفر کرتا ہے جس کو "میوہ ی کال خدا" خدا کا کچا پھل یا" توت بی دانش" علم کے بغیر دانش کا نام دیتا ہے ۔شاعر کا بچپن اور ماضی کو یاد دلانے کا مقصد ماضی اور عرفان کے مراحل کا بیان ہے۔ کال کچا، عدم تکامل کا نمونہ ہے یہ اس وقت کا ہے جب شاعر، عرفان کے شروعات میں تھا، اس مرحلے کے بعد شاعر روحانیت کی طرف سفر کرتے ہوئے اور عروج تک پہنچا ہوا اپنے مشاہدات کا ایسا بیان کرتا ہے :

چیزہا دیدم در روی زمین /کودکی دیدم، ماه رابو میکرد /قفسی بیدردیدم که در آن، روشنی پرپر میزد / نردبـانـی کـه ازآن، عشق مـی رفـت بـه بـام مـلـکوت (277) میں نے زمین پر چیزیں دیکھیں /ایک بچہ دیکھا، جو چاند کو سونگھ رہا تھا/پنجرہ بغیر دروازہ کے دیکھا جس پر، روشنی چلچلاتی تھی /ایک سیڑھی جس پر، عشق ملکوت کی بلندی کی طرف چڑھ رہا تھا۔

شاعر بالواسطہ کہتا ہے کہ وہ کن مرحلوں سے گزر کر ملکوت تک پہنچ گیا ہے۔ شاعر اوپر سے زمین کو دیکھتا ہے اور دھیرے دھیرے شرق کی طرف آتا ہے ۔اصل میں وقت کے عنصر کو نظر انداز کر کے بلکہ اس کو پیچھے ہٹاتا ہے، وہ یونان سے شرق کی طرف آتا ہے:

نظـم درکوچه یونان می رفت /..../ روی دریاچه آرام نگین قایقی گل می برد/ دربنارس سرهرکوچه چراغی ابدی روشن بود (285-284)ترتیب یونان کی گلی میں جارہی تھی /...../ نگینہ کے آرام دریا پر ایک کشتی پھول لے جارہی تھی/بنارس کی ہر گلی کے موڑ پر، ابدی دیا جل رہا تھا۔

ابد وہ وقت ہے جس میں وقت کی کوئی پابندی نہیں اور یہ وقت لگاتار جاری ہے:

شـهـر مـن کـاشـان نیست / شـهـرمـن گـم شـده است/مـن بـا تـاب، باتب/خانه ای درطرف دیگرشب ساخته ام (286) میرا شہر کاشان نہیں ہے/میرا شہر کھو گیا ہے/ میں نے دھڑکتا ہوا، بخار سے/رات کی دوسری جانب پر ایک گھر بنایا ہے۔

شاعر اپنے مکان و زمان سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کی شاعری میں عصیان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، بے خودی کے لمحے میں شاعر کا خیال ناپید ہو جائے اور لمحہ حال سے دور ہو جائے، تو اس کے کلام اور اس کے تفکر میں خاص انداز میں لہریں جھلکتی ہیں۔ سپہری تخلیق کی حرکت، گزرے ہوئے لمحات اور حال کی ابدیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جہان کی نبض کو لمحہ حال سے آشنا کروا کر اس کو "جنبش واژہ زیست" جیون کے لفظ کا ہلنا کا نام دیتے ہیں:

زندگی چیزی بود مثل یک بارش عید یک چنار پر سار /زندگی/ در آنوقت صفی ازنورو عروسک بود/ یک بغل آزادی بود(276) زندگی عید کی بارش اور مینا سے بھرپور چنار جیسی تھی/زندگی/ اس وقت، گڑیا اور روشنی سے بنی ہوئی قطار تھی/ آزادی سے بھرپور آغوش تھی۔

نظم "مسافر" میں شروع ہی سے سفر، وقت و مکان سے لاتعلق ہوتا ہے اور کائنات کے عناصر سے ہم کنار ہوتا ہے:

غروب بود /صدای. ہوش. گیاہان به گوش می آمد /مسافر آمده بود/ وروی صندلی راحتی، کنار چمن نشسته بود (305- 304) سورج ڈوب گیا تھا/نباتات کے ہوش کی آواز سنائی دی رہی تھی/ مسافر آچکا تھا/اور آرام دہ کرسی پر، گھاس کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔

لاوقتی ولامکانی سے سفر یعنی ایک روحانی سفر جو ہر طرح کی دنیوی پابندی سے فارغ ہے:

ہنوز درسفرم /خیال می کنم /در آبہای جہان قایقی است/ ومن - مسافرِ قایق، ہزارہا سال است(310) میں اب بھی سفر میں ہوں/ میرے خیال میں/ جہان کے پانیوں میں ایک کشتی ہے/اور میں۔ کشتی کا مسافر-ہزاروں ہزار سال سے ہے۔

شاعر، وقت و مکان کو گزارتا ہوا اپنی زندگی کو دوسرے لوگوں کی زندگی سے ملاتا ہے اسی لیے اپنے آپ کو "مسافرِ تنہای بادہای جہان" (جہان کے طوفانوں کا اکیلا مسافر) جانتا ہے۔ وقت و مکان شاعر کے لیے صرف ایک ذریعہ ہیں جن کے ذریعے شاعر اپنی زندگی کے بارے میں آرا بیان کرتا ہے:

به یادگاری شاتوت روی پوست فصل/نگاه می کردی / حضور سبز قبایی میان. شبدرہا / خراش. صورت احساس را مرمت کرد(313) موسم کی کھال پر شہتوت کی بنی ہوئی یادگاری کی طرف/ تو دیکھ رہا تھا/ موسمی گھاس کے درمیان سبز قبا کا حضور/ احساس کے چہرے کی چوٹ کو مرہم دے رہا تھا۔

شاید ان لمحات کی عام لوگوں کے لیے قدر نہ ہو لیکن شاعر کی عرفانی سیر کے لیے روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ نسب یعنی "گیاہی در ہند" (ہندوستان میں ایک نباتات) اصل میں وہی ''پشت زمانہا''

(زمانوں کے پیچھے کے باپ کا دوسرا رخ ہے)۔گیاہی درہند" کا بودھ ازم کے تناظر میں مطلب وہی "تناسخ" ہے": کوئی آدمی مرجاتا ہے،اس کی راکھ،مٹی اور پانی سے ملی جاتی ہے،کسی دن کسی پودے میں یا سبزے میں نمود کرتا ہے، بکری اس کو کھا کر دودھ دیتی ہے؛ کوئی دودھ کو پیتا ہے اور آگے یہ سلسلہ جاری ہے۔ نظم "سفالینہ ای از خاک سیلک' اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ،آدمی کی پہلی پیدائش زمین پر،وہی " کاشان" کے سیلک (آثار قدیمہ کاشہ) کی چوٹی پر ہوئی۔ سپہری ہمیں ایسی دیوار دکھاتے ہیں جس کا ایک جھروکا یعنی لحہ حال ہے۔ یہاں سے آدمی دوسرے آدمیوں کے منہ بلکہ کائنات کی جلوہ افگنی دیکھ سکتا ہے۔یہ حالات سپہری کی بہت سی نظموں میں نمایاں ہیں:

سفر مرا به درباغ چندسالگی ام برد/ . . . ./و در مسیر سفر روزنامه های جهان را/ مرور می کردم) (317) سفر مجھے میرے بچپن کے باغ میں لے گیا/------/اور جب سفر کے راستے میں دنیا کے اخبار کو/پڑھتا رہتا تھا۔

حاصل کلام

جدید ایرانی شعرا میں سے سہراب سپہری اسی وجہ سے مشہور ہیں کہ انھوں نے اپنی شاعرانہ زندگی کے راستے میں کئی اصناف شعری کو آزمایا وہ شروع میں کلاسیکی شاعری کے مطابق شاعری کرتے تھے آخر میں اپنی مخصوص طرز پر شاعری کرتے رہے اور انھوں نے اپنے لیے مخصوص شعری لہجے کو اختیار کیا۔ گرچہ سپہری سفر کے دلدادہ تھے اور بہت سے دوست رکھتے تھے لیکن ذاتی طور پر کم گو،تنہا اور خاموشی پسند تھے اور کسی تحریک اور سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں تھے۔ وہ سمبلازم، رومانسازم اور پانتیزم کے زیراثر تھے۔ سپہری اسلامی عقاید کے علاوہ دوسرے ادیان جیسے بودھ ازم اور مسیحیت کا بھی احترام کرتے تھے۔ سپہری کی نظموں میں کائنات اور اس کے عناصر کا استعمال اتنا نمایاں ہے کہ ہم کہہ سکتے کہ وہ کائنات کے بارے میں ہی شاعری کرتے تھے۔

وہ تمام کائنات کو جاندار سمجھتے ہیں اور اپنے تمام احساسات اور میلانات کو کائنات اور اس کے عناصر کے ڈھانچے میں بیان کرتے ہیں۔ان کے شعری مجموعوں میں کائنات کے مختلف پہلوؤں کی تصویرکشی موجود ہے۔ سپہری کی نظموں کا پیغام کل کائنات کی ہمزیستی پر مبنی ہے۔وہ بحیثیت شاعر، ایسے سہارے کو ڈھونڈ ھتے ہیں جو کائنات کے بجائے خود شاعر کی جگہ لے سکے۔ شاعر کی نگاہ میں کائنات تمام جانداروں کا ایک مشترک ورثہ ہے۔ان کے نظریے کے مطابق ہمیں کائنات کو جاننا چاہیئے، پوری کائنات اپنی پنہاں اور پوشیدہ قدروں کے اعتبار سے دیکھنے والوں کے ذہن میں آشکار ہوتی ہے، وہ متعارف زبان کے تعلقات

کو ہنا کر کائنات کے پوشیدہ تعلقات کو بیان کرتے ہیں۔ سپہری کی شاعری میں، انسان اور کائنات کے منفی تعلقات آشکار ہیں اور وہ ہستی اور کائنات کی نگاہ سے دنیا پر نظر ڈالتے ہیں۔ اپنی نظموں میں، کائنات کے چھوٹے اجزا یعنی پوری کائنات کو اپنے اندر منعکس کرتے ہیں یعنی ان کی کائنات پر نگاہ، جز سے شروع ہو کر کُل تک پہنچتی ہے۔

سپہری کائنات سے اکٹھے ہو کر، ہمدردی سے وحدت الوجود تک پہنچتے ہیں اور یہ وحدت الوجود، اس وقت حاصل ہوتا ہے جب آدمی کی تمام ہستی، مکاشفے کے راستے میں کائنات سے مل کر، یگانگی کے بعد کائنات میں ہی اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکتی ہے۔

وہ کائنات کی سیر کے لیے اپنے تمام حواس باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامعہ، طامعہ سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ ایک امپرسیونیسٹ مصور تھے اسی لیے زیادہ تر قوت باصرہ کے ذریعے کائنات کو دیکھتے ہیں۔ وہ پوری کائنات پر توجہ دیتے ہیں: نباتات، جانوروں، اشیا و جمادات، آسمانی کائنات، کہکشانی کائنات وغیرہ۔ ان کی توجہ نباتات اور جانوروں یعنی زمینی کائنات پر ہے اور آسمانی عناصر کو خیال پردازی سے زمینی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

سپہری کی کائنات سے تعلقات کی نوعیت، مذہبی تعلقات کی ایک قسم لگتی ہے اور وہ ایک سچے عارف کی طرح کائنات پر نظر ڈالتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں کچھ عرصے کے لیے دکھ اور اداسی کا شکار ہوتے ہیں اور اس دکھ کو کائنات کے عناصر کے ذریعے نشاندہی کرتے ہیں۔ خلقت کے مختلف مراحل کا جائزہ لیتے اس میں سیر کر کے، اپنے دور کو پرانے عہد سے قیاس کرتے ہیں اور معاشرتی اور سیاسی بدحالی کی وجہ سے افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ ان مراحل میں شاعر اکیلے نہیں ہیں۔ ۔ جب سپہری کائنات میں سیر کرتے ہیں تو کبھی ایسا لگتا ہے کہ ان کی مخاطب ایک عورت ہے اور یہ عورت وہی زن اثیری یا سپہری کی نیمہ مادینہ ہے۔ یہ نیمہ مادینہ عرفان و تصوف میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہ عورت ایک عارف کے کمال کے مراحل میں اس پر ظاہر ہوتی ہے۔ سپہری فطرت کو الفاظ میں ایک لسانی علامت تصور کرتے ہیں اور اس کے لغوی معنی سے گریز کر کے، انھیں استعاراتی اور علامتی معانی میں استعمال کرتے ہیں۔ کائنات کو مقصود بالذات کی بجائے فکر اور خیال کرنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ، کائنات پر انسانیت اور محبت سے بھرپور نگاہ ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی

(۱) " Zen " ذن، جاپانی فرقے کا نام ہے جس کا بر ابر چان چینی (بودسم کی ایک شاخ) ہے جو عرفانی ادراک تک پہنچنے کے لیے، بے واسطہ کشف وشہود کو پیش کرتے ہیں۔

(۲) ''فلسفہ اشراق'' کے بانی شہاب الدین سہروردی تھے۔وہ مسائل کا حل فلسفیانہ استدلال سے کرتے تھے۔

(۳) کاشان میں ایک گاؤں کا نام

(۴) مزید مطالعہ کے لئے نکمنھی زادہ، فاروق .(1383). شاسوس اور شعر سہراب سپہری: زن اثیری واز دواج جادوئی، قصیدہ، تہران،

(۵) عرفانی اصطلاح ہے یعنی روح کی طرف توجہ دینا۔

کتابیات

-آشوری، داریوش" .(1371) .صیاد لحظہ ہا"مشمولہ پیامی در راہ، بہ کوشش داریوش آشوری، تہران: طہوری

-اسلامی ندوشن، محمد علی .(1349) .جام جہان بین، تہران: ابن سینا

-امیر قاسم خانی، شقایق .(1381) .تا شقایق ہست، تہران: شرکت توسعہ کتابخانہ ہای ایران

-براہنی، رضا .(1371) .طلا در مس، جلد دوم، تہران: نویسندہ

-بورکھارت، تیتوس .(1369) .ہنر مقدس ترجمہ جلال ستاری، تہران: سروش

-پیفر ہبری.(1381) .عشق در گذرگاہہای شب زدہ: نقدی بر عاشقانہ ہای معاصر، تہران: ہیرمند

- جامی، عبدالرحمان) .س .ن .(گنج عارفان، مصحح حامد ربانی، تہران: گنجینہ

-دستغیب، عبدالعلی .(1371) .گرایش ہای متضاد در ادبیات فارسی، تہران: خنیا

-زرقانی، سی دمدی(1384) .چشم انداز شعر معاصر ای ران ہر ان: قطر

-ذکریا، خواجہ محمد .(2003) .چند اہم جدید شاعر، لاہور: سنگت پبلشرز

-سپہری، پریدخت .(1382) .سہراب مرغ مہاجر، تہران: طہوری

. . .-سہراب(1384) .ـہشت کتاب، تہران: ثالث

(1380) . . . .-ـ نوروز سفرم، بہ کوشش پری دخت سپری، تہران: فرزان

-سنجری محمود(1378) .، مکاشفہ ہشت، تہران: فرادید

-سید حسینی، رضا .(1387) .مکتب ہای ادبی، جلد دوم، چاپ چہاردہم، تہران: نگاہ

- شمس لنگرودی،محمد.(1377) .از مشروطیت تا کودتا، جلد اول،تهران:نشر مرکز
- عابدی،کامیار.(1384) .از مصاحبت آفتاب،تران: ثالث
- فیلسوفی،محمود" .(1367) .روایتی از یار و بستانی سپهری"،مشموله یاد سهراب سپهری به کوشش ناصر بزرگمهر ،
تهران: دفتر نشر آثار هنری
- کاستاندا،کارلوس.(1375) .افسانه قدرت،مترجم مهران کندری،تهران:میترا
- کاشانی،مشفق) .عباس کیمنش.(1368) .(اوو خاطر سراب،تران: کتاب صبح
- مولوی.(1361) .مثنوی معنوی، جلد اول، مصحح نیکلسون،تهران: امیرکبیر
- نوری،نظام الدین.(1378) .دو شاعر نوپرداز طبیعت: نیما و سپهری،تهران: زهره
- نیچه،فردریش.(1352) .چنین گفت زرتشت،مترجم داریوش آشوری،تهران: نیل